

”ناں، جی۔۔۔ ہیں نہیں۔۔۔ تھے۔۔۔ بھلا ایک وقت میں دو بھی ہو سکتے ہیں؟“ وہ دانت نکونے لگی۔  
 ”اچھا تو دو شادیاں ہوئی ہیں تمہاری؟“  
 ”ہاں جی۔۔۔!“ اس کی غلط بیانی پہ میں جھنجھلا گئی۔  
 بھالی نے مجھے کوئی اور تعداد بتائی تھی۔  
 ”لیکن میں نے تو سنا ہے تین ہوئی تھیں۔۔۔“  
 ”ناں، جی۔۔۔ دو ہی ہوئی تھیں۔۔۔ تیسری تو میں نے آپے کی تھی نا۔۔۔“

”جواب نہیں تمہارا۔“ میں ہنسنے لگی۔  
 ”تو یہ آپے شادی کرنے کا خیال تمہیں اتنی دیر سے میرا مطلب ہے تیسری بار میں کیوں آیا؟“  
 ”پہلی شادی کے وقت تو میں نمائی تھی جی۔۔۔ ماں نے اپنا فیروزہ دیکھ کر رو یاد دیا۔ بڑھا کھوسٹ۔۔۔ دے کا مارا۔۔۔ ہڈیوں کی مٹھ۔۔۔ آم کی چوسی ہوئی گنگ۔ (گٹھلی) جیسا منہ تھا بابے کا۔۔۔ اور تو اور بابے کی مائی بھی زندہ سلامت میرا کلیجہ سواہ کرنے کو موجود تھی۔ یعنی اس کی پہلی بیوی۔۔۔ ہائے۔۔۔ سائہ بی بی! بڑے مشکل چار سال گزارے۔ جان عذاب میں کر رکھی تھی دونوں بڑھوں نے۔ شادی کے بعد کڑیاں ہار سنگھار کرتی ہیں، کوئی روپ اترتا ہے ان۔۔۔ بدن پہ ماس بولی چڑھتی ہے۔۔۔ پرناں جی۔۔۔ ادھر تو میں بابے کا بھی ”ایسرے“ (ایکسرے) بنتی گئی۔ میرا منہ فٹے منہ ہو گیا۔ سولہ ستاراں سال کی میری عمر۔۔۔ اور حال ساٹھ سالہ رانڈوں (بیواؤں) جیسا۔۔۔ دو بچے بھی مر مر کے جنے۔ اس پہ بھی مائی نے طعنے دے کر اپنے جی کو کالی کسانسی لگالی کہ یہ بڑھا کہاں سے بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوتا، ضرور تو کہیں منہ کالا کر کے آئی ہوگی۔ وہ تو اللہ کی قدرت، دونوں بچے مانا بھی اور مانو بھی۔ بالکل اپنے بڑھے پیو کی کاپی۔۔۔ وہی چوسی شکلیں، کچھنی آنکھیں۔۔۔ پھینا ناک۔۔۔ اللہ نے میرا پردہ رکھ لیا اور مائی کو بڑی جونی۔۔۔ بچے میرے ذرا سے۔۔۔ اور میں بیس سال کی جوان جہاں جب بابا مرا۔۔۔“  
 ”پھر تم نے دو سری شادی کر لی؟“ مجھے تفصیل بانٹنے کی جلدی تھی۔

”میں نے نہیں جی۔۔۔ دو سری شادی بھی پہلی شادی کی طراں ہوئی تھی۔ میں تو بابے کے مرنے کے بعد اور دل گئی۔ مائی نے مجھے اور میرے بچوں کو مار مار کے گھر سے نکل دیا۔ ساتھ گندے گندے الزام بھی لگائے۔ پورے محلے کے کون کون سے بندے کے ساتھ میرا یارانہ مشہور کر دیا۔ نہ کوئی ریڑھی والا چھوڑا۔ نہ دیہاڑی والا۔۔۔ سارے میرے معشوق بنا دیے۔ اب ان سب کی زبانیاں۔ یعنی میرے محلے دارنیاں بھی مائی کے ساتھ ہو گئیں اور مجھے مار کٹ کے باہر نکال دیا۔ پھر جناب تماشا دیکھنے والا تھا، اس گلی سے لے کر اسٹاپ تک کوئی بارہ پندرہ منٹ کا راستہ ہے پیدل کا۔۔۔ مولا جھوٹ نہ بلوائے، اس راستے میں کوئی بارہ پندرہ ہی بندے روک روک کر ہمدردی جتاتے رہے۔ اور سارے ہی تقریباً وہ تھے جن کے ساتھ مائی میرے عاشقانے مشہور کر رہی تھی۔“

وہ اتنا بتا کر مینے لگی۔ میں بے چینی سے اس کی بے چنگم اور بے موقع ہنسی رکھنے کا انتظار کرنے لگی۔ کہانی خاصے دلچسپ موڑ پہ آگئی تھی اور وہ آگے بڑھنے کے بجائے نجانے کس بات کو یاد کر کے مزے لے رہی تھی۔

”تو بس۔۔۔“ خوب ہنس چکنے کے بعد اس نے جارحیت کے مقیش والے دوپٹے سے گیلی آنکھیں رگڑیں۔ دوپٹے میں چھید جا بجا نظر آرہے تھے اور مقیش بھی سیاہ پڑ چکی تھی مگر ہلکا نیلا یہ دوپٹہ اس کے پھول دار سوٹ سے میچ ضرور کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا آج بھی میسنگ کا خاص دھیان رکھا گیا تھا۔  
 درجن بھر ہلکے نیلے رنگ کی چوڑیاں بھی تھیں۔ بال جوڑے کے بجائے نیلے پراندے میں گوندھے گئے تھے، البتہ تیل اسی مقدار میں رچا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کاجل کی دھارس باہر لپکے مار رہی تھیں۔ میروں لپ اسٹک ہونٹوں کے کناروں سے پھیلی ہوئی تھی۔

”اللہ تو بس۔۔۔ قسم سے لی لی۔۔۔ اس سے پہلے کبھی ان۔۔۔ دن نے نظر اٹھا کے مجھے نہ دیکھا تھا۔ سارے محلے کے ماننے بابا، اس کی کپتی مائی اور اس کے

سننے بھی مجھے کٹ لگاتے تھے۔ تب کسی کو وہی نہ جانتی۔ آج ساری ماں کے بن کے آرہے تھے۔ سارے کے سارے ہی سہارا دینے کو تیار۔ میں نے زیادہ منہ نہ لگایا بھلا پھیری لگا کے گولا انداز میں بیٹھی بیٹھی دل سے دیہاڑی یہ مزدوری کرنے اور درکشاپوں میں پینچر لگانے والے مجھے اور میرے دو ہاں کو کیا سہارا دیتے۔

میں تو جناب سیدھی گئی اپنے پیو کے گھر۔ میرے دادوں بھائیوں نے بڑا رولا مچایا۔ دونوں مجھے رکھنے پہ تیار نہ تھے۔ بڑا اٹکا سال گزارا۔ ہر روز حج حج۔ مانیوں کو میرے منہ دھوکے پوڈر لگانے پہ بھی تکلیف ہوتی تھی۔ ماں کو یہ رونا کہ میں خضم کے ہرنے کے بعد بھی روز نما کے صاف جوڑا کس کے لیے پہنتی ہوں۔ لوبی لی۔ میرے لیے تو میرا میکہ بھی وہی بن گیا جو بابے کا گھر تھا۔ وہاں بھی میں نے چڑھتی رہی کے سال بابے اور مائی کے ڈر سے مٹی اور سواہ میں ریل کے گزار دیے۔ کتنا جی کرتا تھا میں بھی ویسا ہی بیٹوں کی طرح بندے ہار پہنوں، سرخی پوڈر لگاؤں، چوڑیاں پہنوں، رنگین ریشمی جوڑے پہنوں، پر جی مار لی رہی۔

بابا مرا تو سوچا چلو اب ماں پیو کے گھر ہوں۔ اب تو ارمان پورے کر لوں۔ پرس۔ پر بی لی۔۔۔ میرے اس شوق نے مجھے رول دیا۔ میری اپنی ماں نے گالیاں اور کوسنے دے دے کر سارے محلے میں مشہور کر دیا کہ زر قابو ہونے کے بعد بھی بن ج کے نیایا رہنسانے کے چکر میں ہے۔ اب ماں تو گھر کے دیپرے میں چلاتی تھی۔ پر ہنپوے (دیواریں) کتنے اونچے تھے بھلا بات مشہور ہوئی گئی۔ سال بعد ہی بھالی نے میرا رشتہ طے کر دیا بلکہ رشتہ کیا، سودا کر دیا۔ بدلے میں اپنے لیے دو ہٹی لارہا تھا۔“

”وٹے ٹے کا رشتہ؟“  
 ”کھتے تے سواہ۔“ اس نے برا منہ بتایا۔  
 ”وٹے ٹے میں بھی کوئی برابر ہی ہوتی ہے۔ ادھر کون سا برابر کا جوڑ تھا۔ بھالی میرا اچھا لبا، چھبیس سال

کا جوان۔ پورے ہاتھ پیر کا کارخانے میں ملازم اور وہ جو پندرہ سال کی لڑکی ویاہ کے لایا اس کا بھائی نور دین لنگر دا یو۔ چلتا تھا تو جیسے کوئی کھوٹا لڈیاں ڈال رہا ہو۔“  
 اپنی نشیب پر وہ ایک بار پھر منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہنسنے لگی۔ میرے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ رنگ گئی۔  
 ”بھئی بڑے قہقہے اٹھ رہے ہیں۔ کون سے لطیفے سنائے جا رہے ہیں؟“

اپنے عقب سے مجھے اپنے سر کی آواز سنائی دی۔ میں ذرا سنبھل کے بیٹھ گئی اور دوپٹہ بھی سر پہ رکھ لیا۔ وہ البتہ اسی لاپرواہی سے پلنگ کے پائنٹی الٹی پائنٹی مارے بیٹھی رہی۔

”مسلا ماں لیکم حاجی صاحب۔“  
 ”آں۔۔۔ وسلام۔۔۔ وسلام۔۔۔ ہاں بھی کیا نام ہے تمہارا؟ وہی ہوتا تم۔۔۔“ وہ سر سری انداز میں اس کے سلام کا جواب دیتے سامنے والی کرسی پہ اخبار چرے کے آگے پھیلا کے بیٹھ گئے۔

”آہو جی وہی۔۔۔ حاجی صاحب۔“ وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرائی۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے اشارے کرتی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکی۔ البتہ اس گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

”سائے بیٹے! ماں کہاں ہیں تمہاری؟“  
 ”جی وہ غسل خانے میں ہیں، مجھے بتائیں حاجی صاحب! کوئی خدمت؟“ مجھ سے پہلے زر قانے جواب دیا۔ اباجی مبہم سا مسکرا کے خاموش رہے۔  
 ”چائے لاؤ! اباجی؟“ میں نے زر اخود کو مستعد سی ہو ظاہر کرنا چاہا۔ حالانکہ وہ اس وقت چائے کے عادی نہ تھے۔

”ضرور بیٹا۔“ خلاف توقع جواب ملا۔  
 ”آؤ زر قان! کچن میں آ جاؤ، تم بھی پی لیتا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے مہمان کو کہاں ساتھ لے جا رہی ہو۔ بیٹھی رہنے دو بیچاری کو۔ تمہاری ماں بھی آنے والی ہوں گی۔“  
 میں کچھ حیران ہوئی کہ زر قان کو مہمان کا درجہ کیسے

## ایک نئی خبر

آج مجھے زر قاقے بارے میں ایک نئی خبر ملی ایک اور حیران کن خبر۔  
پچھلے دو سالوں سے میں اسے جانتی ہوں اور ان دو سالوں سے متواتر اس کے بارے میں نت نئی حیران کن خبروں کا ملنا ایک معمول کی بات ہے۔ اس کے باوجود میں ہر بار ہر خبر پر جی بھر کے حیران ہوتی ہوں اور اس بار تو بات بھی خاص الخاص ہے۔  
مجھے عجیب بے چینی سی لاحق ہو گئی ہے اور میں

### ناولٹ



اب زر قاقا کا انتظار کر رہی ہوں۔ کب وہ آئے اور ہمیشہ کی طرح اپنے بارے میں پھیلنے والی خبروں کے بارے میں سن کر پہلے ایک زوردار قہقہہ لگائے پھر ایسی باتیں پھیلانے والوں کو مردانہ قسم کی گالیوں سے نوازتے ہوئے اصل بات بتائے اور میں سسے میں ایک بار پھر پہلے کی طرح اس کی باتوں پر یقین کر لوں۔

یہ میرا اس پہ یقین ہی تو ہے جو دو سالوں سے وہ برابر میرے گھر آ جا رہی ہے، ورنہ... لیکن مجھے ڈر سا ہے کہ کیا اس بار بھی وہ اس خبر کو چٹکیوں میں اڑا سکے گی یا نہیں؟ یہ بات بھی تو معمولی نہیں۔

”اب آپ ہی بتائیے، کیا یہ چھوٹی بات ہے کہ زر قاقا... لیکن نہیں۔ ذرا ٹھہریے۔ پہلے آپ یہ تو جان لیں کہ زر قاقا ہے کون؟“



”یہ کون عورت سے بھا بھی؟“

اس بھرے بھرے جسم والی سانولی سی عورت کو اپنی ساس کی پائنٹی بیٹھ کے ان کے پیر دباتے اور چالپوسانہ انداز میں باتیں کرنا دیکھ کے میں نے اپنی جیشالی سے پوچھا تھا۔

”یہ... انہوں نے چائے بنا تے بناتے کچن کی کھڑکی سے جھانک کے برآمدے میں دیکھا۔“

”یہ زر قاقا ہے۔“ اس مختصر سے تعارف سے میں اور کچھ جان نہ پائی سوائے اس کے کہ بھا بھی کا انداز سرسری اور لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔ میں نے اسی کھڑکی سے دوبارہ جائزہ لینا چاہا اور تدرے تفصیلی



بھی۔ چونتیس پینتیس سالہ وہ عورت بھاری جسامت رکھنے کے باوجود پھرتلی لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ اگرچہ پکا تھا مگر نقش کھڑے تھے۔ ناک سنواں مگر اس پہ چچک کے برانے دلغ تھے۔ ہونٹ بھی بھرے بھرے اور سستی سی لب اسٹک سے رنگے ہوئے تھے۔ بالوں میں تیل بھر کے اس نے کس کے جوڑا لپیٹا تھا جس پہ پلاسٹک کا چمکیلا کلب سجا رکھا تھا۔ ماتھے پہ جلد خشک سی ہو کے اکڑی ہوئی تھی۔ چچک کے دیشوں والی ناک پہ بھی سفید سفید سی خشکی نظر آرہی تھی۔ رنگے ہوئے ہونٹوں کی کئی پھٹی جلد اور ادھڑا ہوا اس حد سے زیادہ خشکی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس سرد و خشک موسم میں جی بھر کے پاؤں گردن پہ تھوپ رکھا تھا۔ اس کا پھول وار ریشمی سوٹ اس پہ خاصا تنگ تھا۔ پلنگ پہ بیٹھے ہوئے اس نے پیٹ اور کولہوں پہ تنگ قمیص کو ذرا سا اٹھا کے گود میں سمیٹ رکھا تھا۔ کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں بھول رہی تھیں اور ناک میں چاندی کی یونگ۔ دونوں کلائیوں میں کلچ کی رنگین چوڑیاں بھی تھیں۔ اتنی آرائش و زیبائش کے نظارے کے بعد اس کے پیروں پہ نظر گئی تو جی مگدر ہو گیا۔ ایڑیاں کٹی پٹی تھیں اور ان میں جمائیل انگلیاں بھر بھر کے نکالا جا سکتا تھا۔ پیلا نکلے فرش پہ رکھی اس کی چپل نئی نکور لگ رہی تھی۔

میں اس جائزے کے بعد اور الجھ گئی۔

”بھلا کون ہو سکتی ہے یہ عورت؟“

وہ اپنے جلیے سے میری ساس کی کوئی رشتہ دار یا عزیزہ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میری شادی کو زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا لیکن اس سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں اپنے بہت سے سرسالی رشتے داروں سے واقف ہو چکی تھی اور در پرے کے جن عزیزوں سے شناسائی نہیں تھی ان کے بارے میں بھی اتنا اندازہ تو بہر حال تھا کہ وہ ایسے گئے گزرے بھی نہ ہوں گے۔ میں ایک ٹل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور

اپنے ہی جیسے گھرانے میں بیاہ کے آئی ہوں۔ تنگ دستی دونوں جانب ہی نہیں تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ عزت دار کھاتے مٹے لوگ ہیں۔ میرے سرسالی والے اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں مگر تہذیب یافتہ ضرور ہیں اور خوشحالی نے تعلیم کی کمی پہ خاصی حد تک پردہ ڈال رکھا ہے۔ ساہیوال اور چیچہ وطنی سے تعلق رکھنے والے میرے شوہر کے ننھیال اور دوھیال والے بھی مرزب اور بول چال پہننے اورڑھنے کے لحاظ سے قدرے ماڈرن کہلائے جا سکتے ہیں جبکہ اس عورت کا ہر ہر انداز بیکار پیکار کر رہا تھا کہ وہ کسی اجڈ اور غیر تعلیم یافتہ بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے۔

”ہو سکتا ہے کوئی پرانی ملازمہ ہو۔“

مگر میں اس امکان پہ بھی مطمئن نہ ہو سکی۔ ہمارے جیسے ٹل کلاس گھرانوں میں خوشحالی آنے کے باوجود بھی بس اوپر کے کاموں کے لیے ایک آدھ نوکرانی رکھی جاتی ہے اور وہ ”اتنی“ صاف ستھری ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ”اتنی“ سے مراد زرقا ہے۔

میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا۔ کام کرنے والی کے ہاتھ میں چوڑیاں سلامت کیسے رہ سکتی ہیں۔ اس گھر میں صبح کے وقت صفائی کرنے بارو آتی تھی جو اسی علاقے کی جمعہ ارنی ہے اور شام کے وقت برتن دھونے اماں نوراں آتی تھی جس کے ہاتھوں کی لکیروں تک میں برتنوں کی کالک رچ بس چکی ہے۔ ہمارے جیسے گھروں میں تو ایسی ہی نوکرانیاں ہوا کرتی ہیں۔ ہاں ہوتی ہوں گی بڑے بڑے علاقوں کے بچے سجائے بڑے بڑے بنگلوں میں صاف ستھری تمیز دار ملازما تیں جو بیگمات کے ایک آدھ بار کے اترے ہوئے کپڑے پہن کے اٹھلاتی پھرتی ہوں گی۔ ہم تو نوکرانیوں کو اترن بھی وہ دیتے ہیں جو سالوں استعمال کے بعد اب پہننے کے قابل نہ رہے ہو۔

”خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ زرقا کے بارے میں کسی بھی قسم کا اندازہ لگانے میں مجھے دشواری اس لیے ہو رہی تھی کہ ملازمہ کی حیثیت سے وہ برتر اور رشتہ داری کے

دالے سے کم تر لگ رہی تھی۔

”ایک تو اماں جی کی موتیں اور بے کاری محفلیں سجانے کا شوق۔“ بھابھی نے بڑبڑاتے ہوئے چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے اور بسکٹ کا ایک نئی پیک کھول کے گنتی کے چار بسکٹ ٹالنے کے انداز میں سجائے۔

”اب میری شکل دیکھتے ہی اسے کپڑے مانگنے یاد آجائیں گے۔“

میں یہی سمجھی کہ اسے اترن مانگنے کا شوق ہو گا اور بھابھی کھمبوں پر لے درجے کی کنبوس اس لیے جانے سے کتراری ہیں۔

”گلا میں چائے لے جاتی ہوں۔ باہر ہی جاری تھی۔“ ان کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میں برآمدے کی جانب آئی۔

”انشاء اللہ نئی دلہن ہے؟ بڑی پیاری ہے۔“

میرے سلام کے جواب میں اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مگر بے حد چمک دار مسکراتی سیاہ آنکھوں سے میرا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے کے بعد کہا۔

”خالہ جی! نئی دلہن کی سلامی تو لیجئے۔“ اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک میلا کچھلا بوڑھ برآمد کیا اور دس دس روپے کے دو مڑے مڑے نوٹ نکال کے میری جانب بڑھائے۔ مجھے ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے نہیں سی آئی۔

”اے رہنے دے زرقا۔۔۔“ اماں نے ہاتھ سے روکا۔

”واہ کیوں رہنے دوں۔ برا وقت آیا ہے خالہ! مگر لمبیے رواج بھولے نہیں ہیں زرقا کو۔ آپ نے تو بیاہ بھولے منہ نہ بلوایا۔ لیکن میں تو دلہن کو منہ اگھائی رہے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

اماں کی آنکھ کے اشارے پہ میں نے باہل خواستہ وہ ایں روپے تمام لیے۔

”شاید کوئی عریب رشتہ دار ہوگی۔ جس سے یہ تو پچھا پھرانا چاہتے ہوں گے، مگر وہ چھوڑنے پہ تیار ہیں۔“

یہ میرا اگلا اندازہ تھا جو پچھلے اندازوں کے مقابلے میں زیادہ قوی تھا۔

”بلوانے کی بھلی کسی تم نے۔۔۔ کوئی اتا پتا ٹھکانہ بتایا تھا تم نے۔ جب لاہور چھوڑ کے گئی تھیں؟“ اماں نے ناراضی سے کہا۔

”آج چار سالوں بعد منہ اٹھائے آگئی ہو اور اپنی ہی ہانکے جاری ہو۔ اس کی خبر اس کی ٹوسے نلانی کی بات ڈھمکانے کی بات اری تا مراد کچھ اپنی بھی تو کہہ؟ کہاں گم رہیں چار سال تک؟ بال بچے کی سناؤ؟“

”ارے خالہ! اپنی کیا پوچھتی ہو۔ یہ چار سال بھی پچھلے تیس سالوں سے الگ تو نہیں تھے۔“ اس نے آہ بھری۔

”اکڑ کے تو بڑا نکلی تھی تو۔۔۔ کہ پٹھان سے ڈرائیور ہے، میرے بچوں کو ہیلی کا جھالا بنا کے رکھے گا۔۔۔ ماں تیری پینتی مرگئی کہ وہ مجھ سے ٹک ڈرائیور نشی ہے۔ تیرے بھائی بھی راضی نہ تھے۔ لیکن تو اپنی کر کے رہی۔ اب آپیں کیوں بھر رہی ہے۔ کہاں ہے وہ تیرا خصم؟“

”وہیں۔۔۔“ زرقا نے اپنی لونگ جڑی ناک چڑھا کے نخوت سے ہاتھ ہلایا۔

”وہیں جہاں وہ دونوں مردار دفنان ہوئے۔“

”پائے پائے۔۔۔“ اماں جو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں ہڑبڑا کے سیدھی ہوئیں۔

”خماں نول کھائی تیرا تھی؟ ہنی تو زنائی ہے کہ ڈانن؟“

اتنی سخت ڈانٹ پھٹکار کے جواب میں وہ اپنے چمک دار دانت نکالے کھی کھی کرتی رہی۔ اور ہاتھ دوبارہ سے اماں جی کی پنڈلیاں دبانے میں مصروف ہو گئے۔

”بڑی ڈھیٹ ہے تو۔۔۔ اور بے شرم بھی۔۔۔ میں بھی کموں، آج چار سال بعد کہاں سے ٹپک پڑی۔ یہ نہ پتا تھا کہ تیرے کو بھی ٹھکانے لگانے کے بعد لونی ہے۔ لیکن اب تو یہاں کرنے کیا آئی ہے۔ ماں تو تیری کلب کلب کے تیرے جانے کے دو مہینے بعد ہی

مرگئی۔ ایک بھائی تیرا کویت چلا گیا۔ دو جا ادھر ہی کہیں ہوگا، لیکن اس نے تو قسم کھائی تھی کہ اب تیرے مرنے پہ بھی تیرا منہ نہ دیکھے گا۔

”نہ دیکھے۔ ادھر کون ترسا بیٹھا ہے۔ مجھے بھی اب کسی کی خاص ضرورت نہیں۔ میرے منڈے اب میرے قد کے برابر آنے لگے ہیں۔ اور میں کون سا کسی کے آسرے بیٹھی ہوں۔ اللہ سوننا ہاتھ پیر سلامت رکھے۔ حق حلال کی مزدور بن کر کے کھائی ہوں۔“

”مزدوری۔؟ وہ کب سے؟“ اماں جی نے آنکھیں سکوڑ کے اسے دیکھا۔ ”اپنے گھر کے چار برتن پانڈے تو تجھ سے مانجھے نہیں جاتے تھے، ختم کے دلیرے (کپڑے) دھوتے تھے موت آتی تھی، اب کون سی مزدوری کرتی ہے؟ تیرے ہاتھ پیر سلامت ہوتے تو گھر نہ بھرتا تیرا موٹی۔“

”ایسی مزدوریاں کرتی ہے زرقا کی جوتی، ابھی ایسا خراب وقت بھی نہیں آیا خالہ! کہ زرقا گھر گھر جا کے پانڈے مانجھے، میرا بندہ نور دین، براتنگ کرتا تھا پیسوں کے معاملے میں۔ تو ساتھ والے گھر کی زبیدہ ایک سلائی اسکول میں کام کرتی تھی وہ اپنے ساتھ لے گئی مجھے۔ چار پانچ مہینوں میں سارا سلائی کا کام فٹ کلاس سیکھ لیا۔ اب میری مشین ہے اور میرے ہاتھ۔ ہائے خالہ، کبھی جوڑا سلوا کے تو دیکھو، کسی بدھیسا سے بدھیسا کارگر درزی سے زیادہ صاف سلائی ہے میری۔“

”میں نے ساری عمر درزی کے ہاتھ کا سلا کپڑا نہیں پہنا۔ نہ کہ اور زن کا۔ جب تک آنکھوں میں دم تھا خود سیتی رہی۔ اب اللہ بھلا کرے نہ بہت کا (بڑی بھالی) سی ہی دیتی ہے۔“

”چھوٹی دلہن! تم سلوا لیا کرنا، ہر نئے فیشن کا پتا ہے مجھے۔“

”ہاں۔ دیکھوں گی۔“ میرے لہجے میں خود بخود رکھائی آئی۔ جس کو میری ساس اس انداز میں گھر کر رہی ہوں، مجھے بھلا کیا ضرورت تھی اس کے ساتھ

خواجوا تیز سے پیش آنے کی۔

”اچھا خالہ۔! میں چلتی ہوں پھر۔ کاکے کو اسکول سے بھی لینا ہے۔“ وہ چپل میں پاؤں اڑسنے لگی۔

”اسکول ڈال رکھا ہے؟“

”ہاں خالہ! بڑے تو پڑھ نہیں سکے۔ ان کے ابا کے سیاپے ہی نہ ختم ہوتے تھے پڑھانا کیا خاک ہے۔ سو چاہے اب چھوٹے دونوں ہی چار جماعتیں پڑھ لیں۔“

”خیر سے اب کتنے ہیں؟“ اماں جی کا انداز سراسر طنز تھا۔ وہ پتا نہیں کبھی یا نہیں بڑے خیر انداز میں گنوانے لگی۔

”بڑے والے نہ مانے“ کا تو تمہیں پتا ہے خالہ۔ اور اس سے چھوٹی والی ”مانو“ کا بھی۔ پھر نور دین کے جو تین تھے، پتہ نہیں تم نے دیکھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ بھی تینوں لڑکے۔ اور اب کریم خان سے بھی دو لڑکے۔ مولا کا کرم ہے، کڑیاں زیادہ نہیں ہوئیں۔“

وہ اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے لگی اور اماں جی نے تکیے کے نیچے سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔

”یہ لو بچوں کے لیے پھل یا مٹھائی لے جانا۔“

”کیوں نہیں خالہ! انہیں بتاؤں گی ان کی نانی نے بھیجا ہے اور خالہ! ابھی تو میں نے چھوٹی دلہن کی ”سما رک“ بھی لینی ہے۔ صرف سو روپے میں ٹرٹھا دیں گی۔“

اس کے مطالبے پہ اماں جی کا ہاتھ دوبارہ تکیے کے نیچے کچھ ٹولنے لگا۔ اتنے میں کمرے سے رافع کے رونے کی آواز آئی۔ میں فوراً اندر بھاگی۔ اپنے پیچھے میں نے زرقا کی آواز سنی۔

”ہائے خالہ! اتنی بڑی خوش خبری۔ اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔ خیر سے پوتا ہوا ہے پوتا۔ سوٹ لوں گی میں اور وہ بھی جالی کا۔“

”نامراد اب جالی کا سوٹ پہن کر کسی چوتھے کو جنم رسید کرتا ہے۔“

اماں جی کی بات سن کر مجھے ہنسی آئی۔

”بڑی دلہن نے بھی ابھی تک بیٹے کی مبارک کا ہا نہیں دیا، جوڑے کالا رکھا ہے۔ اللہ زبیدی والا کرے آپ کے بڑے پوتے کو۔ خیر سے اب یہ سال کا ہونے والا ہوگا۔ لیکن میں اپنا جوڑا مرنے والی نہیں یہ کہہ دیجئے گا بڑی دلہن سے۔“

اس نے منہ بچن کی جانب کر کے اونچی آواز میں نایا۔ اب مجھے بھالی کا باہر جانے سے احتراز سمجھ میں آیا۔

رافع کو تھکتے ہوئے میں نے ایک بار پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ زرقا کا کردار مجھے خاصا دلچسپ لگا تھا۔



اگرچہ اماں جی کا انداز کوئی خاص والہانہ نہ ہوتا تھا، اس کے باوجود زرقا کے لیے گویا یہاں کا راستہ کھل گیا۔ میں نے اپنے جینز کے بہت سے ان سلے سوٹوں میں سے ایک ایسا سوٹ نکال کر اسے دیا جو مجھے کبھی پہننے نہ تھا تو وہ جیسے مجھ پہ ٹار ہی ہونے لگی۔

”چھوٹی دلہن! کتنا بڑا دل ہے آپ کا۔ نیا نکور ڈرڈا دیا۔ واسے کھلے دل اور کھلے ہاتھ والی بیبیوں کو رب تعالیٰ بھی کھلا ہی دیتا ہے۔“

اماں جی ابھی ابھی نہانے کے لیے ہاتھ روم میں مٹھی نکھیں، بھالی ان کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہی ہوتی تھیں اور ان کا نہانا کم از کم تیس چالیس منٹ پہ محیط ہوتا تھا۔ میں نے جو کھٹ مٹھی خبریں بھالی سے اس کے بارے میں سنی تھیں، ان کی تصدیق کے لیے اسے ٹولنا چاہا۔

”بھئی یہ دلہن دو دلہن کیا ہوتا ہے۔ سارے میرا نام تم مجھے میرے سے نام سے ہی پکارو تو اچھا ہے۔“

”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“ یہ تمہید تھی جس کا اس نے وہی جواب دیا جو اس دن اماں جی کو دیا تھا۔

”نور دین۔۔۔ کریم خان! یہ دونوں تمہارے شوہر ہیں۔“

”اے“

بیوٹی بکس کا تیسرا کردار

# سوہنی بیسرائل

- \* گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے،
- \* نئے بال اگاتا ہے،
- \* بالوں کو مضبوط اور چمکدار بنا دیتا ہے،
- \* مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں مفید ہے،
- \* ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



”سوہنی بیسرائل“ قیمت 60 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کراہی میں دستی خرید جاسکتا ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف 60 روپے۔ ہندو شہر والے منی آرڈر بھیج کر جڑی بوٹیوں سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھیجوائیں۔

ایک شیشی کے لیے 80 روپے  
2 شیشیوں کے لیے 140 روپے  
3 شیشیوں کے لیے 210 روپے

نٹ برے ڈاک خراب اور پیکٹ چارج شامل ہے منے آرڈر بھیجنے کے لیے ہماری پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ ٹیکسٹائل انڈسٹریل ایریا، جانا ڈوگرہی، دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیسرائل انڈسٹریل ایریا، جانا ڈوگرہی

9 بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

9 مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی فون نمبر: 773502

دے دیا اباجی نے جبکہ اماں جی مجھے بتا چکی تھیں کہ زرقا کی ماں ان کے گھرانے کی دایہ تھی۔ ان کے سارے بچے اسی کے ہاتھوں پیدا ہوئے تھے۔ باقاعدہ ملازمہ تو نہ تھی لیکن بعد میں بیٹیاں بیٹے بیاتے ہوئے کام کاج کے وقت اسے بلوایا لیا کرتے تھے۔ جوڑے ٹانگتے لٹانوں میں ڈورے ڈالنے سے لے کر شادی کے ہنگاموں میں مہمانوں کی تواضع کرنے اور نوکروں کی نگرانی کرنے تک کے کام خوش اسلوبی سے کر لیا کرتی تھی۔ زرقا بھی کم عمری سے یہاں آئی رہتی تھی اور سب سے مانوس تھی۔ بعد میں شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ کم آئی اور اس سے متعلقہ خبریں زیادہ پہنچا کرتیں۔ کبھی گھر بس جانے کی، کبھی اجڑ جانے کی، کبھی دوبارہ بسنے کی۔ کبھی ایک بار پھر اجڑ جانے کی اور اس دوران پھیلنے والی رنلین داستاؤں کی شہرت بھی۔ لیے دیے رہنے والے اباجی کا اسے مہمان قرار دے کر سامنے بٹھائے رکھنے پہ اصرار حیران کن تھا۔ زرقا البتہ سر نیچا کیے اپنے دوپٹے کی سلا خورہ پیش رکھنے میں مصروف رہی۔ ہونٹوں پہ بڑی عجیب زہریلی سی مسکراہٹ تھی، میں سر جھٹک کے کچن میں چلی گئی۔

مجھے چٹ پٹے قہے کہانیاں سننے سے شغف غمور تھا۔ مگر معنی حل کرنے اور پیمیلیاں بوجھنے سے رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔

چائے لے کر آئی تو اباجی کا اخبار تمہہ شدہ گھنٹوں پہ پڑا تھا اور وہ بڑی خوش گوار سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

”تمہارا حق ہے، بھئی...؟ ب ضرورت ہو کہہ دیا کرو۔“

اور وہ بڑی بے غیرتی کے ساتھ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹھونس رہی تھی۔ مجھے سخت خفت محسوس ہوئی۔ جلدی سے میں نے نظریں جھکا لیں۔

”سائہ! اماں جی نہا چکیں۔ ان کے لیے چائے لے آؤ، میں بیٹران کر رہی ہوں۔“ بھابھی کی آواز آئی۔

اماں جی کو نہانے کے بعد سردی بہت لگا کرتی تھی۔

اب وہ سارا دن برآمدے کا رخ نہ کرتیں بلکہ کمرے میں رضائی کے اندر ہی دیکھی بیٹھی رہتیں۔

”نہا لیا خالہ نے۔“ زرقا نے آواز لگائی۔

”اری موئی تو ابھی تک یہیں ہے۔ کیا چھاؤنی ڈال کے بیٹھ گئی ہے۔ شام گہری ہو رہی ہے، چل اب گھر کی راہ پکڑ۔“ اماں جی نے اندر سے ہی کڑک دار آواز میں حکم دیا۔ وہ برہانے بغیر نکلے گی۔

”چھا خالہ! چلتی ہوں۔ اچھا جی حاجی صاحب۔“ وہ اونچی آواز میں بولی اور اخبار بغل میں دبا کے اندر جاتے اباجی کڑبڑا کے رہ گئے۔

”یہ حاجی صاحب اپنے حجرے سے کیسے نکل آئے اس وقت؟“ اماں جی کی آواز آئی۔ وہ اباجی کے کمرے کو ان کا حجرہ کہا کرتی تھیں۔

میں چائے کا پانی رکھ رہی تھی جب وہ کچن میں آئی۔

”اچھا سائہ بی بی! خالہ کا موڈ ٹھیک نہیں پھر آؤں گی۔ سلائی کے کپڑے تیار رکھنا۔“

چائے لے کر اماں جی کے کمرے میں گئی تو ان کی آواز کی کڑک غائب تھی۔ اب وہ سر جھکائے اپنے گنتی کے چند گیلے بالوں میں لکڑی کا کنگھا پھیر رہی تھیں اور گرج رہے تھے اباجی۔

”لا حول ولا... یہ گھر ہے یا دارالامان۔ جس کے دروازے ہر طرح کی عورتوں کے لیے کھلے ہیں۔ تمہاری شہ ملی ہوگی جو منہ اٹھا کے آجاتی ہے یہ۔ ہمارا ہو بیٹیوں والا گھر ہے، میں ایسی بد معاش عورتوں کی آمد و رفت برداشت نہیں کروں گا۔“

”چھوڑیں حاجی صاحب! غریب عورت ہے میکہ چھٹ گیا ہے، ہمارے گھر کے بہانے پچھلوں کو یاد کرتی ہے۔“

”کہاں کی غریب... غریب عورتوں کے یہ پچھن ہوتے ہیں؟ یوں لیا پوتی کی ہوتی ہے انہوں نے؟ اور میکہ اس کے اپنے گرتوں کی وجہ سے چھوٹا ہے۔ اپنے پچھلوں کو اس نے خود دیا ہے۔ میں آئندہ ایسی ہمدردیاں نہ دیکھوں۔ اس گھر میں دو دو جوان لڑکے

ہیں۔ کسی آس پہ ہی چکر لگاتی ہے۔“

ان کی بات پہ میرا دل سکر گیا اور میں ذرا دیر کو بھول ہی گئی کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، چند منٹ قبل اس کے برعکس کر رہے تھے۔

”رفع دور، اس کی اسٹوری۔ لعنت بھیجو، آئندہ زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔“

شہود کے بارے میں حد سے زیادہ پوزیشنوں میں الٹ سی ہو گئی اور پکا ارادہ کر لیا۔ اتنے میں شہود اور شاہد بھائی بھی گھر لوٹ آئے اور محفل گرم دیکھ کے موضوع بحث دریافت کیا۔

”وہی حرافہ لوٹ آئی ہے۔ بتایا تو تھا۔“ بھابھی بردبرہائیں۔ شاہد بھائی کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کون؟“

”ارے کچھ نہیں۔ وہ زرقا ہوا کرتی تھی نا... اپنی رشیدن کی لڑکی۔ وہ آئی تھی۔ تمہارے اباجی نے نسا کھڑا کر دیا۔“

میں نے کن اکھیوں سے شہود کی جانب دیکھا۔ وہ اماں جی کی چائے کے ساتھ رکھے بسکٹ کھانے میں مصروف تھے۔ ان کو خاص دلچسپی نہ لیتے دیکھ کر میرا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلی مرتبہ جب وہ آئی، اس دن اتفاق سے میں تھوڑی دیر پہلے ہی بازار سے لوٹی تھی۔ میرے ارد گرد آنے والے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ سلائی کا کام میں گزارے اتنی جانتی ضرور تھی مگر ایک تو ویسے ہی اس طرف دلچسپی اور رجحان کم تھا، دوسرے نئے رانج کی وجہ سے تک کے سلائی کا کام کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے سارے سوٹ پہننا مجھے پسند نہ تھا۔ درزی سے نئے نئے فیشن کے لباس سلوانی اور ایسا کرتے ہوئے مجھے اپنی ساس کے کبھی دے تو کبھی ۱۰۱ کا ف الفاظ میں اعتراضات سننا پڑتے۔ درزی کیا کم لیتے تھے۔ بھابھی تو سیدھا سارا شلو اور قمیص گھر پہ لے کر پہن لیتیں۔ مجھ سے رہا نہ جاتا اور دل نہ چاہتے

کے باوجود درزی کے بل بھرتی۔ ابھی بھی اسی کوفت کے عالم میں بیٹھی تھی۔ کپڑے خرید کے لانا ایک خرچا، ان سے میچ کرتے لیس اور نیتے من خریدنا دوسرا خرچا اور درزی کا بل سب سے بڑا خرچا۔

”کاش ڈھنگ سے سلائی کا کام سیکھا ہوتا تو آج ان چاروں سوٹوں کی سلائی کے چھ سات سو روپے بچ جاتے۔ دو کے ساتھ تو میچنگ سینڈ لیس آہی جاتیں۔“

میں یہی سوچ رہی تھی جب وہ سیدھی میرے کمرے میں گھس آئی۔ دوپہر کا وقت تھا اور اماں جی ظہر کی نماز سے لے کر عصر کے وقت تک قیلولہ کیا کرتی تھیں ورنہ شاید وہ اسے کمرے کے اندر نہ آنے دیتیں۔ بھابھی تو اسے زیادہ منہ نہ لگایا کرتیں اور میرے بھی زرقا سے زیادہ گھلنے ملنے پہ اماں جی نے ناپسندیدگی ظاہر کی تھی جسے میں خاطر میں نہ لاتی۔ یہ الگ بات کہ اوپر سے ”جی حضور“ کر لی تھی۔

”لاؤ بی بی! میں سی دیتی ہوں کپڑے۔ ایک بار آزماؤ تو سہی۔ اپنے درزی کو بھول نہ گئیں تو پھر کہنا۔“

”اتنے قہنگے سوٹ ہیں، خراب مت کرو نا۔“ میں ہچکچائی۔

”لو... کر لو گل...“ وہ برہان گئی۔ ”زرقا نے کیا کبھی منگے جوڑے دیکھے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے جینز اور بری تک کے جوڑے مجھ سے سلواتے ہیں۔“

”جینز اور بری سے یاد آیا زرقا... تم اس دن اپنی شادی کے بارے میں بتا رہی تھیں جو تمہارے بھائی نے وٹے ٹے میں کی تھی۔ کیسا تھا تمہارا دوسرا شوہر؟“

”بیٹا تو تھا... لنگڑا...“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں ناک چڑھائی۔

”نانگہ چلا تا تھا... عورت اور گھوڑی میں کوئی فرق نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ہی چابک، ہم دونوں یہ استعمال کر لیتا تھا۔“ وہ میرے کپڑے کھول کھول کے جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”اور اس کی عمر... پہلے کی طرح وہ بھی بڑھا چوٹس تھا کیا؟“

”نہیں، خیر۔“ وہ ہاتھ روک کے فضا میں دیکھتی جیسے اس کا حلیہ یاد کر رہی تھی۔

”اس کی طرح سٹھ (سال) سال کا بیماریوں کا مارا ہوا تو نہیں تھا لیکن میرے جوڑ کا پھر بھی نہیں تھا۔ میرے دو بچے تھے، ایک بندہ بھگت چکی تھی، زمانے کے ٹھڈے بھی بڑے کھائے تھے پھر بھی اکیس سال کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ تب بھی بڑا روپ تھا میرے پہ۔ اس چھلے جتنی کمر تھی میری۔“

اپنی انگلی میں موجود پھنسے ہوئے چاندی کے چھلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے مبالغہ آمیزی کی انتہا کر دی۔

”اور وہ پچاس بیالیس سال کا توے کا پٹھا پاسا (الٹی طرف) اتنا کالا۔۔۔ رنج کے کالا جیسے کسی نے اس کے منہ پہ سیاہی کا پورا ڈول گرا دیا ہو۔ ایک آنکھ کالی۔۔۔ ایک ٹانگ پولیو میں ماری ہوئی۔۔۔ اس پہ بھی خرہ دیکھنے والا تھا کم بخت کا۔ کڑکڑ کرتے جوڑے پہنتا تھا، چٹے دودھ۔۔۔ رگڑ رگڑ کے دھودھو کے دبا دبا کے استری کر کے میرے سٹھے رہ جاتے تھے اور وہ کانا لنگڑا بن پھب کے باہر نکل جاتا تھا۔ ایک نمبر کا کبڑوس، آٹا گوندھنے بیٹھتی تو کہتا۔ اپنے لیے گوندھ، میرا پیٹ خراب ہے۔ وال پکاتی تو کہتا۔ آج میں نے نہیں کھانی۔ تڑکانہ لگانا، بعد میں اہلی ہوئی وال کے ساتھ اپنی ایک روٹی لے کے بیٹھتی تو نیڑے (پاس) آجاتا۔ ادھی روٹی توڑتا۔ ”خوشبو تو اچھی ہے۔“ کہہ کر اس ادھی روٹی پہ گھی لگا کے وال میں ڈبو کے کھا لیتا۔ ایک روٹی سے اس سائڈ کا لیا بنتا تھا، بعد میں باہر جا کے اور بھی کھاتا تھا لیکن مجھے پانچ سالوں میں اس کے گھر برج کے روٹی نصیب نہ ہوئی۔ بی بی! تم خود اندازہ کرو، میرے دونوں بچوں کا کیا حال ہوتا ہو گا فاقے کر کر کے اس سے میرے تین لڑکے ہوئے۔ اسے تو اپنی سگی اولاد تک کا خیال نہ تھا۔ بس نوکرانی چاہیے تھی۔

میرا بھی دل آخر ایک دن تنگ پڑ گیا۔ کیوں کرتی میں اس کی چاکری، اس کے کپڑے کس لیے دھو کے چکاتی، اس کی روٹی کس لیے پکاتی، کون سا کھدے رہا

تھا مجھے۔ دوسری طرف اس کی چندال بہن عیش کر رہی تھی میرے بھائی کے گھر۔ میں نے نیچے اٹھائے اور آکے بھائی کے گھر بیٹھ گئی کہ میرا فیصلہ کراؤ۔ وٹے سٹے کا رشتہ ہے تو جو سکھ اس کی بہن ادھر لے رہی ہے، مجھے بھی وہاں ملنا چاہیے۔ میں نے غلط کیا بی بی؟“ اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں میری جانب اٹھا کے سوال کیا۔ میری گردن نفی میں اٹ گئی۔

”بھائی نے خوب مارا۔۔۔ اس کی زنائی نے گالیاں دیں۔ میرے بچوں کو چپڑیں لگائیں۔ میں بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ، جم گئی۔ اسی طرح دو مہینے گزارے۔“

”پھر۔۔۔؟“ میرا تجسس عروج کو پہنچ گیا۔

”پھر بھائی نے فیصلہ کیا نہ نور دین نے۔ فیصلہ

میرے سوہنے رب نے کر دیا۔ نور دین کا ٹانگہ آیا بس کے نیچے اور وہ ڈھالی منٹ میں ختم۔ فیصلہ آپے ہو گیا۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کے مسکراتی ہوئی مجھے بڑی بے حس سی لگی۔

”اس کے بعد تیسری شادی تم نے خود کی۔ یعنی محبت کی شادی۔“

”او چھڈو بی بی جی! کیسی محبت؟“ اس نے سر جھٹکا۔ ”ظاہر ہے خود کرنے والی شادی تو محبت کی شادی ہی ہوتی ہے۔ اس بار تم نے بندہ اپنے جوڑ کا ڈھونڈا ہو گا۔ کم عمر، خوبصورت دل والا، صحت مند۔ اماں جی بتا رہی تھیں پٹھان تھا پھر تو خوب گورا چٹا، اونچا لمبا ہو گا“ اسی لیے شادی کرنے کی جلدی تھی۔“

”سچی بتاؤں سا رہ لی بی! تو میرے دل سے شادی کے ارمان ہی ختم ہو گئے تھے۔ کوئی چاؤ نہیں تھا اب تیسری بار گھر بسانے کا۔ میں تو صبر کے ساتھ دجی واری راندھو کے ماں کے گھر بیٹھ گئی مگر کوئی سکون کے ساتھ بیٹھنے دے تب نا۔ میری اس ڈیڑھ فنٹ کی بھر جانی نے شور مچا دیا کہ اس کانے لنگڑے کی موت میں میرا ہاتھ ہے اور یہ کہ میں اسی لیے میکے آکے بیٹھی تھی کہ میری نظر میں کوئی دوجا آگیا تھا۔ اسی دوجے کے ہاتھوں میں نے نور دین کو مروایا ہے۔ اس کو مارنے کو دل تو بڑا تھا میرا لیکن ہمت نہیں تھی۔ ہمت ہوتی تو پانچ سال بھوک کیوں

جھیلتی، کب کا مار چکی ہوتی لیکن وہ زلیل روز محلے کی عورتوں کی پنجایت بٹھا کے میری جھولی سچی باتیں سناتی۔ میری ماں نے بھی ایک لفظ میرے حق میں نہ بولا۔

میرے منڈے اُپتے ہو رہے تھے، مانو بھی سیانی ہو رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی ہمیں ذلیل کرتا سارا نیر، دو جا بدنامی مفت کی۔ ایسے میں کریم خان ملا۔ رب کی قسم، میں نے اسے نہیں ڈھونڈا۔ آپے مجھ پہ عاشق ہو گیا اور بی بی! ایک بات اور سچی سچی بتا رہی ہوں۔ واقعی وہ گھروں سے باہر نکلا تھا مگر میں نے اس سے نکاح اس کی شکل دیکھ کے نہیں کیا۔ اس کے وعدے سن کر کیا تھا۔ کھانا پیتا ڈرا سورا تھا۔ اپنا مکان تھا اس کا پنڈی میں۔ کھلے دل کا بھی تھا۔ میرے لیے ہی نہیں، میرے بچوں کے لیے بھی کھنے لاتا رہتا۔

جب اس نے نکاح کے لیے کہا تو میں فٹ راضی ہو گئی۔ میرے بچے پیٹ بھر کھاتے، اسکول پڑھتے، میرے سر پہ چھت ہوتی اور کیا چاہے تھا لیکن میرے بھائی اڑ گئے۔ اس ڈائن نے مشہور کر دیا کہ اس ڈرا سورا کے ہاتھوں میں نے نور دین کو مروایا ہے۔ حالانکہ تب میں جانتی تک نہ تھی کریم خان کو۔ سارے اس کی طرف ہو گئے۔ آخر میں نے لعنت بھیجی سارے کے

ساروں پہ اور کریم خان کے ساتھ لاہور چھوڑ دیا۔ ”بعد میں احساس ہوا کہ تم نے ٹھیک کیا یا غلط؟“ ”بی بی! اس وقت کے لحاظ سے تو ٹھیک ہی کیا تھا اور کیا کرتی میں۔ بھائی آنہ دینے کے روادار نہ تھے۔ بھابھی کبھی بچوں کو جھوٹا کھلا دیتی، کبھی وہ بھی کھانے کو نہ دیتی۔ بہترے گھروں میں کام ماننے گئی۔ زنانیاں میری بدنامی کے ڈر سے مجھے گھر پہ کام دینے کو تیار نہ ہوتیں اور مرد گھر سے باہر ”اپنے کام“ کروانے پہ تیار۔ بدنام تو میں تھی بی بی! لیکن دل سے بناؤ۔ سچ میں ایسی ہوتی تو بچے بھوکے کیوں مر رہے ہوتے، مجھ پر چیتھڑے کیوں لٹک رہے ہوتے، کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ اگر میرے دس بارہ یار ہیں تو میں گھر گھر روٹی کیوں مانگتی پھرتی ہوں۔ ادھر بھی آئی تھی میں، خالہ تو شاید

رکھ لیتیں پر بڑی بی بی نہ مائیں۔ اچھا ہی ہو اور نہ خالہ کی نظر میں میرے لیے جو تھوڑی بہت عزت اور پیار ہے وہ بھی نہ رہتا۔ مرد تو سارے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔“

”اور وہ کریم خان... وہ بھی؟“ ”ہاں تو وہ زمانے کے مردوں سے نرالا تھا کیا جیسے مجھ پہ عاشق ہوا، مجھ سے پہلے بھی کتنوں پہ ہوا ہو گا۔ اس سے مجھے کیا غرض۔ مجھے تو اس وقت اسی میں اپنی بہتری نظر آئی۔ میں نے اپنا گھر بسالیا۔“

باہر سے اہل جی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ عسکر کی نماز ادا کرنے برآمدے میں آرہی تھیں۔ زر قانے جلدی سے کپڑے سمیٹ کر شاپر میں ڈالے۔

”آپ دیکھنا ساروں بی بی! کیسے زبردست سیوں گی۔ سارے نئے فیشنوں کا پتہ ہے مجھے۔“

میں ابھی تک سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بیڈیہ بڑے دھلے کپڑوں میں سے ناپ کا جوڑا تاکہ اٹھائے چلتی بنی۔

بعد میں مجھے الجھن سی ہوتی رہی۔ پتہ نہیں کیسی سلانی کرتی ہے۔ شہود نے میری الجھن دیکھ کر وجہ پوچھی۔

”نہیں، کچھ نہیں۔ وہ... میں... آج شاپنگ کر کے لوٹی تو زر قانہ آگئی۔ سلانی کے کپڑے اسے دے دیے، آپ پریشان ہوں کہ خراب نہ کر دے۔“

”تو تم نے دیے کیوں، تمہارا درزی کیا مر کھپ گیا ہے۔“ وہ اٹھا بگڑ گئے۔

ایک روپیہ تک نہیں دوں گا یاد رکھنا۔“

شہود کا غصے میں آنا ضرورت سے زیادہ شدید رد عمل تھا۔ اس سے قبل انہوں نے میرے اتنے ذاتی اور گھریلو مسئلوں میں ایسی دلچسپی نہیں لی تھی۔

”اب کیا ہو سکتا ہے۔“ ”ہو کیوں نہیں سکتا۔ میں ابھی جا کے تمہارے کپڑے واپس لے آتا ہوں۔“

”آپ کو کیا پتہ اس کے گھر کا۔“ میں چونکی۔ ”کون نہیں جانتا۔“ وہ استہزاء سے ”اس محلے میں وہ چند مہینے قبل آئی تھی مگر اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کی ماں ہمارے ہی نہیں، اس پاس کے اور کئی گھرانوں کی آیا رہ چکی ہے۔ سب ہی اس کے واقف کار ہیں۔ آئی جاتی رہتی ہے سب ہی کے ہاں۔ کسی نہ کسی سے پوچھ لوں گا۔ اتنا تو پتہ ہے کہ گھالی کے نیچے رہتی ہے۔“

ہم اندرون شہر کے ایک متوسط علاقے میں رہتے تھے۔ بھول بھلیوں والی پختہ گلیوں میں کچھ مکان ہمارے گھر جیسے تین تین منزلہ اور ماربل سے سجے ہوئے بھی تھے اور کچھ دو ڈھالی مرلے کے درمیانے درجے کے بھی۔ ہمارے گھر سے چار گلیاں پرے مین روڈ تھی جس کے دوسری طرف ایک گھالی نیچے اترتی تھی، جہاں کسی زمانے میں کچی آبادی ہوا کرتی تھی۔ اب اس کچی آبادی میں بھی جھکیوں اور سرکنڈوں کی جھونپڑیوں کے بجائے کچے لکے دو دو کمروں کے مکان تھے۔ شہود اسی جگہ کا ذکر کر رہے تھے۔

رات کو واک کے لیے نکلتے ہوئے شہود مجھے کہہ گئے کہ وہ واپسی پہ میرے کپڑوں کا شاپر لے آئیں گے۔ بھابھی کے کفن میں یہ بات پڑ گئی۔

”کون سے کپڑے؟ ان کپڑوں کا ذکر تو نہیں ہو رہا ہے جو آج زر قانہ لٹی تھی؟“

”جی بھابھی! وہ لے لو گئی تھی لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کپڑے واپس لیتے آئیں، مجھے نہیں سلوانے۔“

”تم نے کہا یا یہ آئیڈیا شہود کے دماغ میں آیا؟“ وہ

مسکرائیں تو میں گڑبڑا گئی۔ شہود کا پرہ رکھ کے میں نے بات اپنے اوپر۔

”میں اس سے کیا غرض۔ آپ تو جانتی ہیں وہ کتنے لا پرواہ رہتے ہیں گھریلو باتوں سے۔ وہ تو جانے پہ تیار نہ تھے۔ میں نے ہی اصرار کر کے بھیجا ہے۔ مجھے اپنے کپڑوں کی بڑی فکر تھی۔“

”ناگل ہو تم، کوئی مرد کو دھکے دے کر بھی کھالی کی جانب بھیجتا ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابھی! بھلا شہود کو زر قانہ سے میرا مطلب ہے۔ بھئی آپ اس کو ایک نظر دیکھیں تو سہی۔ اب شہود کا ذوق اتنا خراب بھی نہیں۔“

”اور نیت؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”مرد عورت کی شکل و صورت نہیں دیکھتا، کم از کم اس اسٹیج پہ تو نہیں۔ شادی یا محبت وغیرہ کے مرحلوں میں شاید شکل و صورت کو اہمیت دیتا ہو لیکن دل پشوری کرنے کے لیے وہ صرف بڑی شہرت والی عورتیں پسند کرتا ہے۔ کسی نیک بی بی پہ ڈورے ڈال کر ایک شادی شدہ مرد نے چھتر کھانے ہیں کیا؟ بری عورت خود، خود مرد کو کساتی ہے۔“

”دہ بری عورت نہیں ہے بھابھی! بس ذرا۔“

”کیا بس ذرا۔ تم اس کے رنگ ڈھنگ تو دیکھو۔ بیوہ ہونے میں ہیٹ ٹرک کر چکی ہے مگر کہیں سے لگتا ہے؟ چلو عمر زیادہ نہیں، پہلی شادی لڑکپن میں ہو گئی تھی لیکن بچے تو جوان ہیں۔ بڑی لڑکی چودہ سال کی ہو گئی ہے۔ ماں کو کھلے گریبان کی، شوخ رنگوں کی ڈنگ والی قمیص پہن کر ڈیپٹہ گلے میں رسی کی طرح لٹکائے، میک اپ سے آراستہ ہو کے تیرے میرے گھر کے چکر لگانے سے فرصت نہیں۔ وہ تو شکار ڈھونڈنے نکلتی ہے اور تم ایسی بد شو، خود شکار بنا کے اپنا شوہرا اس ”مرد خور“ کی کچھار میں بھیج دیا ہے۔“

رات کو شہود اپنے معمول کے وقت سے کچھ لیٹ آئے۔ میں نے وجہ پوچھی۔

”خود ہی تو اپنے کام سے بھیج دیا تھا۔ اتنا مشکل پتہ

تھا اس کا۔ اونچا نیچا راستہ۔ یہ تو تمہاری کپڑے بڑی مایوس نظر آرہی تھی بیچاری۔ کہہ رہی تھی کہ اس نے ایک سوٹ سینا بھی شروع کر دیا تھا۔ فیص سی دی تھی شلوار کاٹ کے رکھی ہے۔ اب اس ایک فیص کی سلانی کا حساب کتاب تم خود کر لیتا۔

میں نے بڑے شوق سے وہ سلی ہوئی فیص نکالی اور حیران رہ گئی۔ فیص واقعی بڑی نفاست اور صفائی سے سلی تھی۔ جدید تراش خراش کا ڈیزائن کسی عمدہ بوتیک سے چرایا ہوا لگ رہا تھا۔

”سلانی تو واقعی بہت اچھی ہے اس کی۔ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ہائے شہود! سو روپے میں ایسی سلانی۔ غلطی کی میں نے کپڑے واپس منگوا کے۔“

”تو بیچ واپس دے آتا ہوں۔“

میں بری طرح ہڑبڑا کے رہ گئی۔ بھابھی کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگے۔

”بہت مہربانی۔ آئے گی تو لے جائے گی۔ آپ کیوں بے کار کی زحمت کرتے ہیں۔ ویسے بھی گاڑی میں درزی تک لے جاتے آپ کو آکس آتا ہے۔ پیدل چل کے اونچا نیچا راستے طے کر کے اس کی طرف جاتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہوگی؟“ میرے خشک لہجے پر وہ چپ ہو گئی۔

زر قاقا کی جانب سے میرے دل میں بال آگیا جو اس سے اگلی ملاقات پر خود بخود دور ہو گیا۔

”ساتھ بی بی! برانہ ماننا لیکن اپنے میاں کو آئندہ میرے دروازے پر مت بھیجنا۔“

”کیوں؟“ میں چونکا ہوا ہوں۔

”میں خالہ کی بہت عزت کرتی ہوں، وہ بھی مجھ غریب کا اتنا خیال رکھتی ہیں اور ساتھ بی بی! آپ۔۔۔ آپ خود اتنی بھلی ماں ہو۔ آپ کے ساتھ میری وجہ سے کچھ برا ہو، یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”صاف صاف کہو زرقا!“

”میں تو محبت اور عزت کی بھوک ہوں۔ ادھر آتی ہوں تو اس لیے نہیں کہ یہاں کوئی چیز کھانے کو ملتی ہے۔ خالہ اور ان کے بعد آپ میرے ساتھ بیٹھا بول

لیتے ہو، میں خوش ہو جاتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کسی وجہ سے آپ کے دل میں میرے لیے میل آجائے اور میں اس عزت سے بھی جاؤں۔“

اس نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا۔ میں اس آن پڑھ اور بظاہر بے حس و لاپرواہ عورت کی قیافہ شناسی پہ حیران ہوئی۔

”میں تو بڑی ٹھہری، میرے دروازے پر رات کے وقت آنے والا مرد بھی برا ہی کہلائے گا۔ لوگ تو یوں بھی ٹاک میں رہتے ہیں میری غلطیاں پکڑنے کے لیے چاہے کچھ نہ بھی کروں مگر دوسرے کا کیا کرایا بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔“

”تو تم سنبھل کے رہا کرو زرقا!“ اس نے جس طرح خود سہو کو اپنے ہاں بیٹھنے سے منع کیا تھا اس سے میرے دل میں موجود غلط فہمیاں خود بخود ختم ہو گئیں۔ میں ایک بار پھر اپنے اس خیال پر پختہ ہو گئی کہ وہ بری نہیں، صرف قسمت کے ہاتھوں بری مشہور ہو چکی ہے۔

”پا ہر نکلتے ہو۔ نہ چادر ہی اوڑھ لیا کرو۔ جوان بیٹیوں کی ماں ہو اور پھر برانہ ماننا بیوہ ہو۔۔۔ ایک نہیں، تین تین بار۔ اس پر یہ بناؤ سنگھار، چوڑیاں، شوخ رنگوں کے کپڑے۔ عمر کا نہیں تو بیوگی کا لحاظ ہی کر لو۔ لوگوں کی زبانیں خود بخود بند ہو جائیں گی۔“

”رہنے دو بی بی! لوگوں کی زبانوں کا ایسا ہے عورت کو اکھاڑ دیکھ کر دینے ہی باہر لنگی رہتی ہیں۔ میرے بارے میں پہلی بار باتیں تب پھیلی تھیں جب میں بیوہ نہیں تھی، سہاگن تھی لیکن بیواؤں کی طرح اجڑی ہوئی رہتی تھی۔ آپ سنگھار کی بات کرتی ہو، مجھے کنگھی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہفتہ ہفتہ بھر جوڑا نہیں بدل سکتی تھی۔ ایک کچی چوڑی نہیں تھی میرے ہاتھ میں۔ اس اجڑی پجڑی حالت میں بھی مانی نے میرے دس یا دھو ہونڈ نکالے تھے۔ وہ دوسرے نور دین لنگڑے کی ویسے ہی جان نکلتی تھی دمڑی خرپتے ہوئے۔ اس نے کیا سنگھار کرنے سے اور وہ کریم خاں۔۔۔ پیسہ تو بڑا تھا اس کے پاس، کھانا تو ضرور کھلاتا تھا مگر زرا منہ رگڑ

کے دھولوں تو سو سوال کرتا تھا۔ اتنا گند بھرا تھا داغ میں۔ میں نے تو ڈر کے مارے شیشہ دیکھنا تک چھوڑ دیا۔ توبہ بڑا شکی تھا۔ اب چھٹکارا ملا ہے ان تینوں سے تو کیوں نہ اپنے دل کی کروں۔ ساری جوانی سواہ کرلی مردوں کی مرضی پہ چل کے۔ اب میں اپنی خوشی سے اپنی اور اپنے بیٹوں کی کمائی پہ بنتی ٹھنتی ہوں، کسی کا کیا لگتی ہوں۔ میرے سارے ارمان کیا میرے ساتھ ہی قبر میں جائیں گے؟“

”اچھا بھی کرو جو جی چاہتا ہے کرو۔“

\*\*\*

اب اس کے پاس یہاں آنے کی ٹھوس وجہ تھی۔ وہ میرے پاس سلانی کا کام لینے اور سلے ہوئے کپڑے دینے آئی رہتی تھی۔ اماں جی نے بھی اب میرے اس سے بدستانہ گانٹھنے پر اعتراض کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اماں جی کی جب اس پر نظر پڑتی وہ ضرور باتیں بناتے مگر اس کے جانے کے بعد۔

کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے وہ لٹو لے کر آئی۔

”خالہ! میں نے مانو کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔“

”ہیں۔۔۔ مانو کا۔۔۔ بھلا کیا عمر ہوگی اس کی؟“

”اس بھادوں پندرہ کی ہو گئی تھی۔“

”اور تمہیں اس کے بیاہ کی بھی پڑ گئی۔“ اماں جی نے گھر کا۔

”کیس اپنی ماں کی طرح تم نے بھی کسی بڑے سے تو سودا نہیں کر دیا اس کا؟“

”نہ خالہ۔۔۔ اماں بہشتن کو اللہ بخشے، میں نے تو معاف کر دیا لیکن سچی بات ہے اولاد کے لیے خاص طور

پر میرے لیے تو اس کے کھجے میں ذرا چاہ نہ تھی۔ میرا

ایسا پتھر دل نہیں۔ میں نے مانو کا رشتہ بڑی اچھی جگہ

طے کیا ہے۔ راج کرے گی۔ منڈا بھی راج کے سونا

ہے۔ اپنی مانو کی ہے تو منڈا بھی اکیس بائیس سے زیادہ

نہیں۔“

”ذات برادری کا ہے؟“

”ذات برادری پر زرقا تھوکتی بھی نہیں۔ میری

میلی کا دیور ہے۔ ماں پو مرک گئے۔ تین بھائی ہیں۔“

دونوں بڑے دیا ہے (دیا ہے) ہوئے اور اپنے گھر بار والے ہیں۔ ذاتی مکان ہے شاہدرہ میں۔ منڈا دس جماعتیں پڑھا ہوا بھی ہے۔ انارکلی میں بیگم والی مشین لے کے بیٹھتا ہے۔ روز کی سات آٹھ سو روپے کی دس ماڑی ہو جاتی ہے کرایہ نکال کے اور کیا چاہیے۔“

بعد میں میرے کمرے میں آئی تو میں نے لیکچر دینا چاہا۔ کم عمری کی شادی کے نقصانات۔۔۔ جلد بازی کے نتائج۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

”آپ کی ساری باتیں سچی بی بی۔۔۔ مگر میری مجبوری

بھی تو دیکھو۔ بڑے والا مانا، کسی ناخنے گانے والی کے چکر

میں ہے۔ دیکھ لیتا اور کوئی دنوں میں سب چھوڑ چھاڑ

اس کے کونٹے پہ جا بیٹھے گا۔ اس لنگڑے کے تینوں

منڈے بھی اپنے پو کی طرح کالے دل کے ہیں۔ دو تو

ابھی چھوٹے ہیں، میرے کہنے میں ہیں لیکن بڑا والا

ابھی بارہ سال کا ہو گا مگر سگریٹ پینے لگا ہے۔ ہورے

(پتہ نہیں) بھرے ہوئے یا خالی۔۔۔ سمجھو وہ بھی ہاتھ

سے نکلا کہ نکلا۔ میں جوان لڑکی کس آس پہ گھر

بٹھاؤں۔ کس بھائی نے ذمہ داری اٹھانی ہے۔ رضیہ

نے اپنے دیور کا رشتہ دیا تو موللا کا شکر ادا کر کے ہاں

کر دی۔ بن باپ کی بچی ہے بی بی۔۔۔ بڑی ذمہ داری

ہے۔“

پہلی بار اس کے لہجے میں مجھے خالص ماؤں والی

فکر مندی نظر آئی۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

”آج لگ رہا ہے زرقا! کہ تم بھی بیٹی کی ماں ہو۔

تمہیں بھی بیٹی کی فکر ہے۔“

میری اس بات نے نجانے اس پر کیا اثر کیا کہ وہ

پھپھیک کر رو پڑی۔ پہلے بھی کئی بار اس سے گزرے

کل کی باتیں سنتے ہوئے میں نے اس کی آنکھیں

ڈبڈباتے پائیں تو کبھی پلکیں بھینکتی دیکھیں لیکن مردار

توتھوپی میں وہ انہیں چھپا لیا کرتی تھی۔ آج نجانے کیا

بات تھی کہ اس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش

نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں اس

دوران حیران رہا، مانا۔۔۔ ہاں! لے لے لے لے! (۱)

”ہوا کیا زر قا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”کیا بتاؤں بی بی! جو بات اب تک کسی کو نہیں بتائی وہ کیا بتاؤں۔ اگر بتا دیتی تب شاید کوئی صحیح فیصلہ کرنا کہ میں اچھی ماں ہوں یا بُری ماں لیکن میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ جو کیا اپنی اولاد کے لیے کیا دوسروں سے کون سا انعام لینا تھا یا شاہاشی ملنی تھی اس لیے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”کیا...؟ کیا نہیں بتایا؟ کیا چھپاتی رہی ہو تم زر قا؟“

”سائربلی بی! میری نیت جھوٹ بولنے یا چھپانے کی نہیں تھی۔ دراصل چھ سال بعد جان پہچان والے لوگوں میں لوٹی اور انہیں ایک بار پھر اپنے گھر کے اجڑنے کی بات بتائی تو پتہ نہیں کیسے سارے یہ سمجھے کہ پہلے دونوں کی طرح کریم خان کو بھی موت آگئی ہوگی اور میں نے بھی اصل بات چھپالی کہ میں تیسری بار بیوہ نہیں ہوئی بلکہ... بلکہ کریم خان سے طلاق لے لی تھی میں نے وہ تو آسانی سے نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس مرحلے کے کونسلر وغیرہ بلا کے ساری اصلیت سب کے درمیان رکھی۔ پنچایت کے زور پر طلاق لی تھی۔ اب یہ سب یہاں آگے جاتی تو ایک بار پھر یہ بات مشہور ہو جاتی کہ ضرور زر قا کا دل کسی اور پر آگیا ہوگا۔ کوئی اور مرغا پھانس لیا ہوگا جب ہی طلاق لے لی۔“

”لیکن طلاق کی وجہ کیا تھی؟ کیا اس کی شک کی عادت؟“

”نہیں بی بی! شک ہی کرتا تھا نا۔ اتنا ہی کہتا تھا کہ پردہ کروں بازاروں میں نہ پھروں۔ تو ٹھیک ہے میں نے مان لیا تھا۔ اس کے بدلے میرے اور میرے بچوں کے سر پہ چھت تو بھی نا۔ نور دین کی طرح چابک نہیں برساتا تھا میرے پنڈے پہ۔ نہ ہی پہلے والے بابے کے سارے ٹبر کی طرح اس کے اگلے پچھلے مجھ پہ پل پڑتے تھے۔ کبھی سال بعد عید شب برات پہ اپنے پنڈے لے جاتا تھا تو سارے بڑی عزت کرتے تھے میری۔ حالانکہ نہ مجھے ان کی بولی پلے پڑتی تھی نہ میری ان کے...“

”پھر؟ خرچا پورا نہیں دیتا تھا۔ نشہ وغیرہ۔ یا کس دوسری عورت کا چکر؟“

”خرچہ تو بہت کھلا دیتا تھا۔ ہاں بھئی اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ اس کا کیا اس کے آگے آتا ہے اور میرا کیا میرے آگے۔ جو بھی برا اس نے کیا اس کا حساب میرا مولا لے گا لیکن میں کیوں کھایا یا حرام کروں۔ جو بات حق ہے وہ سینہ ٹھونک کر کہوں گی۔ جو کماتا تھا میرے ہاتھ پہ لا کر رکھ دیتا تھا۔ نوکرانی کا سکھ بھی ساری زندگی بس ایک اسی گھر میں دیکھا۔ میں اپنے پچھلے بچوں پہ جو خرچ کرتی اس پہ بھی اعتراض نہیں کرتا تھا اور رہا نشہ۔ تو نسوار بھلا کوئی نشہ ہے؟ دوسری عورت کا چکر... ہو گا یا نہیں، مجھے کیا پتہ اور کیا فکر۔ مرد روز رات وقت پہ گھر آجائے اتنا بہت ہوتا ہے باہر پھر جو مرضی کرتا پھرے۔“

”اوہ تو تمہیں پھر تکلیف کس بات کی تھی؟“

”وہ کوئی دور پہاڑوں کا رہنے والا پٹھان تھا۔ اپنی برادری میں اس نے شادی اسی لیے نہیں کی تھی کہ اس کی ذات برادری میں رواج تھا کہ لڑکی پیسے دے کر لی جاتی تھی۔ پیسہ تو تھا اس کے پاس لیکن پنڈی اور لہور (لاہور) جیسے شہروں میں رہتے رہتے اسے لگا کہ جب مفت میں گھر بسایا جاسکتا ہے تو کیوں پچاس ساٹھ ہزار دے کر بیوی خریدی جائے۔ وہی پیسہ اپنے اوپر کیوں نہ لگائے بندہ۔ ایک عید پہ میں ہمیشہ کی طرح نیچے ساتھ لے کر اس کے پنڈ گئی۔ وہاں اس کے چاچے نے میری مانو پہ نظر رکھی اور پچھا ہی پکڑ لیا کریم خان کا۔ وہ بندہ بشر... آگیا لالچ میں۔ دو لاکھ کے بدلے میری بارہ تیرہ سال کی مانو کو اس پچاس سالہ چاچے کے بلے پاندھنے پہ راضی ہو گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ سو تلی بیٹی تھی اس لیے کریم خان کا دل پتھر ہو گیا۔ اس کا اپنا خون ہوتی تب بھی یہی کرتا۔ وہ سالوں سے اپنے خاندان میں یہی ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں بیٹی یا بہن دے کر پیسے لے لینا کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن بی بی! میں ایسا کیسے ہونے دیتی۔ میں اتنا بھگت چکی بھئی میرے سے زیادہ کون جان سکتا تھا کچی عمر میں سوت کا

## موٹاپے سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے، موٹاپا اور پیٹ کا بڑھ جانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی طرح چہرے پر مہاسے کیل، جھانیاں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔

خواتین کے ان تمام مسائل کا حل



ٹاپ جڑ کی روٹیوں سے تیار کردہ

Wahid's

JAUHAR-HAZIM®

واحد کا جو ہر مہاسہ

موٹاپا، پیٹ کا بڑھ جانا، معدے گرانی و تیز امیت۔

کیل مہاسے، چھپ، چھانیاں دور کرے

قیمت = 60 روپے

\* خوب اسٹور کیسٹ: 5212257

\* خان بوتل اسٹور پاپو منڈی شاد عالم گیٹ لاہور  
فون: 7665454, 7663508

\* باب الشفا درو خانہ مجنہ چوک سلطان 4576350

\* پارشاد ہی ڈی D3/89 بوہڑ بازار، راولپنڈی،

فون: 7116666

\* عبدالواحد محمد شریف شائق شاہ نمبر 67 غزوہ شارع عبداللہ فیصل مد

مکرہ۔ سعودی عرب۔ 5745243

Wahid Herbs Lab Karachi-Pakistan

”آتی کیسے نہ خالہ! آتا ہی بڑا۔ پیٹ کی بھوک بڑا کچھ کرواتی ہے۔ جن کا آسرا تھا وہ تو ایک ایک کر کے گھونسلے چھوڑ گئے۔ اب جو چھوڑے ہیں ان کو بھی تو اس قابل بنانا تھا کہ وہ پر نکالیں۔ ایک بار پھر مجھے چھوڑ کے اڑنے کو۔“ وہ خود پہنسی جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ ”اس لیے آتا ہی بڑا کام کروں گی تو گزارا ہو گا نا خالہ! مشورہ آپ کا بھی برا نہیں۔ دل تو یہی کرتا ہے کہ منہ چھپا کے کہیں پڑی رہوں۔“

”میری تو نامراد ایسے کرتوت چھوڑ کیوں نہیں دیتی کہ منہ چھپانا پڑے۔“

اماں جی کی بات پہ وہ بدک اٹھی۔

”میں نے کیا کیا ہے خالہ۔ کیا کیا چھوڑوں میں؟ اب تو بس ساہ (سائس) ہی ہے جو چھوڑوں تو میری خلاصی ہو۔“

”سنا ہے زر قا! تمہارا اپنی بیٹی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارا گھر چھوڑ کے واپس اپنے سسرال چلی گئی ہے اپنے شوہر کو لے کر۔“ میں نے صاف صاف سوال کیا۔

”بی بی! جب اس پارو کالے بوتھے والی نے سارا کچھ نمک مریچ لگا کے بتا ہی دیا ہے تو گھما پھرا کے سوال کیوں کرتی ہو۔ سیدھی بات کرو نا کہ زر قا تیری ماں تیرے بھائیوں تیری خصموں اور باقی سارے زمانے کی طرح تیری بیٹی بھی تیرے منہ سے کالک مل کے گلے میں جو تیلوں کے ہار پہنا کے چلی گئی ہے۔“ وہ سسک اٹھی۔

میرے سامنے وہ پہلے بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی لیکن یہ پہلی بار تھا کہ یہاں پر آمدے میں بیٹھ کے سب کے سامنے وہ یوں رو رہی تھی اپنے غم دکھا رہی تھی ورنہ تو وہ مجھے اکثر کھا کرتی تھی۔

”سائہ بی بی! یہ تو آپ اپنی اپنی سی لگتی ہو تو میں دل کی باتیں کر جاتی ہوں ورنہ زر قا نے اپنے رونے کسی کے آگے نہیں روئے۔ کیا فیہ؟ قیص اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے۔“

اور آج وہی زر قا بھابھی تک کے سامنے چمکوں

زر قا کو بٹھا کے کھانا پڑے۔ اٹا اس کا بوجھ بانٹے گا۔ چھوٹے لڑکوں کو بھی بڑے بہنوئی کا لحاظ ہو گا اور وہ بڑے بھائیوں کی طرح آوارہ نہیں نکلیں گے۔“

اب اس کا آنا کم کم ہو گیا، سلائی کا کام لینے آتی تو بس گھڑی دو گھڑی رکتی اور سٹلے ہوئے کپڑے کسی بیٹے کے ہاتھ بھجوا دیتی۔

اور اب۔۔۔ اب یہ جو نئی خبر سنی ہے یہ سب سے زیادہ چونکا دینے والی خبر ہے۔ میں یقین کر بھی نہیں پار رہی اور جھٹلا بھی نہیں پار رہی کہ اس بار اس پہ انگلی اٹھانے والا کوئی اور نہیں اس کی اپنی بیٹی مانو ہے۔



”اس بار بہت راہ دکھائی زر قا!“

کئی دنوں بعد وہ آئی تو میں نے کہا۔ مت مت مت سی لگ رہی تھی وہ۔ اور پہلے سے بدلی ہوئی بھی۔ آج بھی ریشمی تیز رنگوں والا برنڈ سوٹ پہن رکھا تھا اس نے، لیکن صاف لگ رہا تھا کہ یہ لباس کئی دنوں سے تبدیل نہیں ہوا۔ سبز روئے یہ کھو چیں بھی گئی ہوئی تھیں اور گھی کے داغ بھی تمیل کے دھبوں کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ چوڑیاں پرانہ، کلب لپ اسٹک، کاجل کی دھاریں پاؤڈر کی سفیدیاں سب کچھ نادر۔ ”بس۔۔۔“ اس نے آہ بھری۔ ”دل ہی نہیں کرتا باہر نکلنے کو۔“

”تو اب بھی کیوں آئی؟ پڑی رہتی کو ٹھری میں منہ چھپائے۔“

اماں جی نے تیز لہجے میں کہا جس دن سے انہوں نے پارو کی زبانی زر قا اور اس کی بیٹی مانو کے مابین ہونے والے اس تازہ ترین معرکے کا سنا تھا، انہیں زر قا پہ بہت خار تھی جو انہوں نے چھوٹے ہی نکالی۔ پارو۔۔۔ یعنی ہماری جعدارنی جو وہیں کہیں گھالی کے نیچے والی آبادی میں زر قا کے گھر کے آس پاس رہتی تھی۔ اس نے یہ واقعہ سنایا بھی خاصے چھپنے انداز میں تھا۔ اصلیت جاننے کی کھد تو میرے اندر بھی تھی، اس لیے میں بھی اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

عذاب اور بڑھے خصم کی صورت میں سر پہ لگتی تلوار۔ میں نے اپنی اور کریم خان کی جان ایک کر دی۔ وہ پٹھان خون ضد میں آگیا ورنہ لاکھ لاکھ کا اپنا مکان تھا اس کا۔ کوئی ساٹھ ہزار کے زیور تھے میرے۔ بس پٹھی مت (النار داغ) اڑ گیا ایک بات یہ۔ صاف کہہ دیا۔ ”اگر یہ میری لڑکی نہیں ہے تو اس گھر میں کیوں رہتی ہے، کیوں پال رہا ہوں میں اسے، کیوں کروں میں اس کی شادی، کس لیے جینزدوں؟ اور اگر میں باپ ہوں مجھے سارے فرض نبھانے ہیں تو میرا حق ہے میں جہاں مرضی اس کی شادی کروں۔“

میں نے پھر آخری فیصلہ کیا جس چیز کی دھونس دے رہا تھا وہی چھوڑ دی۔ اب نہ اس کا مجھ سے کوئی رشتہ نہ میری بیٹی سے۔ پر میں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔ کون یقین کرتا، میری تو اپنی ماں نے بھائیوں نے کبھی میری ذات پہ اعتبار نہیں کیا تھا۔ پر اے کیا کرتے، کسے مانتے کہ میں نے اپنی بیٹی کو دکھ سے بچانے کے لیے عیش و آرام کی زندگی کو لات ماری ہے۔ پکا مکان، گھنے لٹے، نوکرانی، عزت کی زندگی، صحت مند کھانا کھاتا میرے سب چھوڑ دیا۔ ساروں نے ایک ہی بات کہنی تھی۔ ”لو، آئی زر قا۔ اس بار مرد ہٹا کٹا تھا، آسانی سے مرا نہیں، اس لیے طلاق لے کر آئی۔ یہ کہاں بس سکتی ہے اتنے دن کسی ایک کے ساتھ۔“

وہ خود ہی اپنے بارے میں بکو اس کر کے زور زور سے ہنسنے لگی لیکن اس بار میں اس کی بات پہ مسکرا نہ سکی۔

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کی شادی فوراً کر دی۔ اس کے خدشے درست تھے۔ بڑے دنوں لڑکے ایک ایک کر کے گھر چھوڑ گئے۔ اس کے گھر چلنے کا واحد آسرا اس کی سلائی کا کام رہ گیا تھا۔ اچھے وقت پہ اس نے مانو کو بیاہ دیا۔

کچھ ماہ قبل سے شاید کوئی ڈیڑھ دو ماہ پہلے پتہ چلا کہ اس کا داماد اپنے بھائیوں سے لڑکے کی پوی سمیت اس کے گھر آ بیٹھا ہے۔ اماں جی نے تبصرہ کیا۔ ”چلو اچھا ہے، لڑکا کافی (مختی) ہے۔ نکٹو نہیں جو۔“

پہلوں رو رہی تھی۔

میری طرح اماں جی کا دل بھی اس کے آنسوؤں نے کچھ موم کر دیا۔

”اب روئے جائے گی بد بخت۔۔۔ اصل بات نہیں بتائے گی کہ اس مانو موئی نے اتنی بڑی بات کی کیسے؟ وہ تو بڑی بھلی مانس لڑکی ہے، ضرور کسی کے بہکاوے میں آئی ہوگی۔ کہیں اس کے مرو کی تو کوئی چال نہیں؟“

”وہ بے چارہ کس کھاتے میں؟ خود حیران پریشان ہے نماں۔“ زر قانے سوں سوں کر کے سرخ ہوئی ناک رگڑی۔

”ساری غلطی میری ہے خالہ! مانو بے چاری کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو بچی ہے، مجھے ہی سمجھنا چاہیے تھا، خیال رکھنا چاہیے تھا لیکن مجھ کم بخت کو اپنی عقل ہوئی تو رونا کس بات کا تھا؟ ساری غلطی میری سے ساڑھ بی بی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

وہ مسلسل روتی جا رہی تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے لگا، یارو کا بیان کہیں نہ کہیں درست تھا۔ پارونے بھی یہی کہا تھا کہ زر قانے بی بی کے منہ سے یہ بات سن کر بھڑکی ضرور تھی مگر جب وہ گھر سے باہر نکلنے کے محلہ اکٹھا کر کے واویلا کرنے لگی تو زر قانے کی ہو گئی تھی۔ ہر الزام پہ وہ خاموش سر جھکائے کھڑی رہی تھی۔ ”ضرور اس کے دل میں چور ہو گا بی بی جی! اور نہ سچا بندہ دو لفظ تو اپنے لیے کہتا ہے۔“

اور اب اس کا اپنی غلطی تسلیم کرنا مجھے شک میں ڈال رہا تھا کہ ہونہ ہو، زر قانے کی ماضی کی تلخیاں اور محرومیاں اس بار اس کے ہاتھوں کوئی بڑی اور سنگین حرکت کروا بیٹھی ہیں۔ مجھے اس سے کھن سی آئی۔ یہ ٹھیک تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا مگر اس نے۔۔۔ اگر واقعی اس نے یہ حرکت کی ہے تو۔۔۔؟

”کیا کیا ہے تم نے زر قانے؟“ میں نے خشک انداز میں پوچھا۔

”میں نے۔۔۔ بی بی بی! اپنے، وائی ندیم سے بہت پیار کرنے لگ گئی تھی۔“

اس کی بات پہ میری اوپر کی سانس اوپر نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ بھابھی تو کانوں پہ ہاتھ لگا کے توبہ استغفار بڑھنے لگیں اور اماں جی مارے بے یقینی اور حیرت کے کوئی رد عمل تک ظاہر کرنا بھول گئیں۔

”اچھا تو وہ مجھے پہلے ہی لگتا تھا پہلے دن سے، اسی لیے مانو کا ویاہ کیا تھا اس سے لیکن جس دن سے وہ میرے گھر آ کے رہنے لگا اور بھی پیارا ہو گیا۔ بی بی، ساتھ ساتھ رہنے سے دوسرے کے لیے پیار پیدا ہو ہی جاتا ہے۔“

وہ نائیدی انداز میں ہم سب کو باری باری دیکھنے لگی پھر ہماری مشترکہ خاموشی سے مایوس ہو کے آگے بتانے لگی۔

”اور پھر ندیم تو ہے ہی اتنا اچھا۔ میں نے آج تک اتنا اچھا منڈا ساری حیاتی نہیں دیکھا۔ اتنا بیبا، اتنا شریف، ہر بات میں ہاں جی کہنے والا۔ مانو کی اپنی جھٹائیوں کے ساتھ بنی نہیں تو وہ اس کے ایک بار کہنے پہ ہی اسے لے کر ادھر آ گیا۔ اتنا پیار کرتا ہے مانو سے اور مانو۔۔۔ وہ تو شیدا ان ہے شیدا ان۔۔۔ اپنی عقل سے کام لینا اسے آتا ہی نہیں۔ پوری لالی لگ (دوسرے کی باتوں میں آجانے والی) ہے۔ ایویں اپنے بندے پہ شک کیا اس نے۔ غلطی تو میری تھی اس بیچارے کا۔۔۔“

”اوہو، کیا غلطی تھی تمہاری۔ بتاتی بھی نہیں ہو۔“ میں اس کی بات کاٹ کے پیچنی۔ وہ عجیب متضاد بیانات دے رہی تھی۔ خاک بھی پتے نہیں بڑھا تھا۔

”وہی تو بتا رہی ہوں ساڑھ بی بی! وہ بیچارہ نئی عمر سے ماں کو ترسا ہوا۔ بھر جائیوں نے اچھا برا جیسا بھی سلوک کیا، گزارا کر لیا۔ ادھر میں بڑے دنوں پتروں کے جانے کے بعد ندیم کو دیکھ کے پھر سے جی اٹھی۔ وہ دنوں تو کیکر کے رکھ (درخت) تھے۔ دنوں کے دل میں نہ ماں کے لیے پیار تھا نہ عزت۔ ندیم تو مجھے عزت بھی دیتا تھا، ماں بھی رکھتا تھا میرا۔ میں نے بھی جی بھر کے چاؤ اٹھائے اس کے، مانو کو تو سمجھو، منجی پہ بٹھادیا شہزادی بنا کے۔ گھر کے سارے کام اور ساتھ ساتھ

ندیم کے بھی سارے کام اپنے ہتھ لے لیے۔ اس کا بھلا چاہتی تھی اس لیے اسے سمجھایا کہ بھلے وہ اپنا گھر چھوڑ کے ادھر رہے مگر اپنا حق نہ چھوڑے۔ وہ گھر اس کے بھائیوں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ہے۔ اسے اپنا حصہ لینا چاہیے۔ بات اس کے بے بڑگئی اور جب وہ اپنا حصہ مانگنے گیا تو اگلوں کو ہو گئی تکلیف۔ رضیہ میری ہی سہیلی تھی، جانتی تھی کہ مانو اتنی سیانی کہاں یہ مست (عقل) میں نے ہی دی ہوگی، اس لیے وہ ہی الٹی پیڑھا گئی مانو کو۔ اس نے ہی مانو کے دماغ میں یہ گند بھریا کہ میں اور ندیم۔۔۔ توبہ۔۔۔“

اس نے کٹھ پتلی اور پھر سے رونا شروع کر دیا۔

”لیکن میں پھر بھی کہوں گی کہ ساری غلطی میری ہے۔ رضیہ نے جو کچھ کہا، ہو سکتا ہے مانو یقین نہ کرتی۔ اگر میری غلطی نہ ہوتی تو لیکن یہ میرا ہی کیا دھرا تھا جو مانو۔۔۔“ اس کی ہچکیاں وقفہ وقفہ سے جاری تھیں۔ اماں جی منہ کھولے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں بھی الجھ سی گئی۔

”اس میں تمہاری کیا غلطی جبکہ ابھی ابھی تم نے کہا ہے کہ تم ندیم کو اپنا داماد اور بیٹا سمجھ کے چاہتی تھیں۔ جب تمہاری نیت ٹھیک تھی تو قصور تمہارا کیسے ہوا؟“

”ہے نا بی بی۔ میرا ہی قصور ہے۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”بی بی! میں بری عورت ہوں نا۔ مجھے بھلا کیا حق کہ میں اپنی نیت ٹھیک رکھوں۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ بری عورت جو بھی کرے، وہ برا ہوتا ہے، اسے برا ہی جانا جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی سے نکاح پڑھانا ہی ہو کہ اللہ نے تو یہ وہ کو وہ دوسرے نکاح کا حق دیا ہے نا لیکن میں بری عورت تھی اس لیے میرا یہ کام بھی جائز ہونے کے باوجود برا ہی بن گیا۔ میں نے بی بی کی شادی چھوٹی عمر میں اس لیے کی کہ پتہ نہیں آگے میری بدنامی کی وجہ سے اس کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ آتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں بری عورت تھی اس لیے آپ نے یہاں سوال یہ کیا کہ زر قانے تو نے بھی بی بی کا سودا تو نہیں کر دیا کسی نہ سے؟ میں بری عورت تھی، مجھے جوالی کہیں مان

کے اس سے پیار جتانے کی جرات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بری عورت کا پیار بھی تو برا ہی ہوتا ہے۔ بری عورت بھلا پاک رشتے کیسے بنا سکتی ہے۔“

اس کے سوال پہ میں اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے پلکیں جھکا کے رہ گئی۔ اماں جی بھی دوپٹے سے آنکھیں رگڑ رہی تھیں اور بھابھی۔۔۔ حیرت کر، بات تھی کہ بھابھی۔۔۔ زر قانے سے ہمیشہ کی الراجک بھابھی۔۔۔ بڑی دل سوزی کے ساتھ اس کے شانوں پہ اپنا ہاتھ پھیلائے اس کے سانولے چہرے پہ پھیلے آنسو صاف کر رہی تھیں۔

\*

رضیہ جمیل کے شاہکار افسانے

بد ریا برس گئی اس پار

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت گیٹ آپ

برہنوں کے لئے خوبصورت تحفہ

قیمت : /150 روپے

اس کے علاوہ 2 مکمل ناولوں کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

اک گھروندہ برف کا، /300 روپے

ناگ دریا بادل بوند، /300 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی